مَوتُ العَالِم مَوتُ العالَم

راشد الحق سمیع حقانی

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ قدس سرہ کی رحلت' ہندوستان میں ایک ہزار سالہ مسلم عظمت و شوکت کا خاتمہ

داغِ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی　　　اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

خوں شدہ قلب و جگر کے ساتھ ایک ایسی ہستی کا شکستہ اور دلبر داشتہ قلم ماتم کر رہا ہے' جس نے فکر و خیال اور دل و دماغ کو نئی سمتوں سے روشناس کرایا تھا۔ جس نے عمر بھر عالم اسلام کو بیداری 'حمیت' شجاعت' صداقت' خودداری دین و مذہب کے ساتھ وابستگی اور دعوت و عزیمت کا درس دیا تھا۔ اور جس نے ہندوستان میں تقسیم کے بعد مسلمانانِ ہند کو فکری لحاظ سے گرنے نہیں دیابلکہ انہیں فکری' دعوتی' سیاسی' سماجی اور معاشرتی طور پر از سرِ نو عزت و وقار کے ساتھ جینے کا ہنر اور حصول کامیابی کا قرینہ سکھایا۔ اور جس نے عجم کے لالہ زاروں سے لیکر عرب کے ریگزاروں اور دشت و صحرا تک کو اپنے علوم و فنون اور آفاقی پیغام سے نہ صرف سیراب کیابلکہ بنجر زمین بھی چشمک زنِ فصل گل بنادی۔

یہ عظیم ہستی جنہیں علمی دنیا علی میاں کے پیارے اور محبوب نام سے جانتی ہے۔ اور جن کے امت مسلمہ پر ان گنت اور بے شمار عظیم احسانات ہیں۔ آج اسی باعث عالم اسلام کے علمی و دینی حلقوں میں ان کی جدائی اور فراق پر شور ماتم بپا ہے۔ ع

ماتم یہ زمانہ میں بپا میرے لیے ہے

اور حق تو یہ ہے کہ اگر امت مسلمہ حضرت علی میاںؒ پر آج نہ روئے تو پھر انکی آنکھوں کا نم ہمیشہ کیلئے خشک ہونے کے قابل ہے۔ آج اگر حکیم الامت علامہ اقبالؒ زندہ ہوتے تو انکے سانحہ

ارتحال پر ایسا خون آشام مرثیہ لکھتے کہ انکی والدہ مرحومہ کا مرثیہ لوگ بھول جاتے۔ اور اگر امام الہند مولانا حضرت ابوالکلام آزادؒ بقید حیات ہوتے تو ان کے قلم معجز رقم سے نکلی ہوئی سطور کے سامنے "غبارِ خاطر" جیسی شاہکار کتاب بھی ماند پڑ جاتی اور مولانا سید سلیمان ندویؒ اپنے تعزیتی شذرے سے وہ قیامت برپا کرتے جس کے سامنے شورِ قیامت اور آوازِ محشر بھی نحیف ہو جاتی۔ اور مولانا عبدالماجد دریا آبادی بھی بزبانِ قلم وہ نوحہ وگریہ کرتے جس کے سامنے طوفانِ نوح بے معنی ہو جاتا۔ افسوس! صد افسوس! کہ حضرت جیسی عظیم عبقری شخصیت کا ماتم ہم جیسے تہی مایہ اور علمی سرمایہ سے بے بہرہ اور آپکے کمالات و صفات کے ادراک سے ناواقف و بیگانے اطفالِ مکتب کے حصے میں آیا۔ لیکن .....

مرے قلم میں ادیبوں کی اب وتاب نہیں متاعِ دیدہ خوناب لے کہ آیا ہوں

آپ نے مشرق و مغرب کے علوم وفنون نہ صرف مطالعہ کئے بلکہ آپ ان پر اتھارٹی سمجھے جاتے تھے۔ حضرت علامہ اقبالؒ کی طرح آپ کا مطالعہ بہت گہرا تھا۔ اور آپ نے بھی مشرق و مغرب کے علمی میخانوں سے اپنی علمی تشنگی بجھائی۔ اسی طرح مذاہب عالم پھر تقابل ادیان اور خصوصاً عیسائیت اور یونانی اور رومی مکاتب فکر کے قدیم عقائد و نظریات کیساتھ ساتھ موجودہ عالمی سیاست پر بھی آپکی بڑی وسیع نظر تھی۔ اسکی واضح مثال آپ کی مقبول عام کتاب "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" ہے۔ جسے پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کن علوم وفنون اور معلومات کے عظیم ذخائر سے مالامال تھے۔

آپکی تحریر کا ہر ہر لفظ امت مرحومہ کی عظمت رفتہ کی یاد میں ڈوبا ہوتا تھا۔ آپ کے ہر مقالے اور مضمون میں امت مسلمہ کی نشاۃ ثانیہ کا سامان حیات موجود ہوتا۔ آپ کی ہر تقریر اور ہر نصیحت سوز و گداز اور فکری اور دعوتی پیرائے سے لبریز ہوتی۔ الغرض آپ کی ذات مبارک ایسا چراغ رہگزر تھا جس سے ہر سمت میں روشنی کی شعاعیں پھوٹتی رہیں۔ اپنے بھی اس سے فیض حاصل کرتے رہے۔ اور اغیار نے بھی اپنے افکار کی ضیا اسی سراج منیر سے حاصل کی۔

علی میاں کی شخصیت بیسویں صدی کی ممتاز ترین مسلم شخصیات میں سے ایک ہے۔ لوکہ

آپ عمر کے لحاظ سے ان اکابرین کی صف میں شامل نہیں تھے لیکن اپنے بینظیر کارناموں اور محیر العقل خدمات کے باعث آپکا مقام تاریخ اور اکابرین کی پہلی صفوں میں بن گیا۔ کسی نے صحیح لکھا ہے کہ علی میاں کی جگہ مولانا ابوالکلامؒ' علامہ اقبالؒ اور مولانا اشرف علی تھانویؒ کے مساوی بن گئی ہے۔

آپ نے عمر بھر باطل مذاہب کا بھرپور شائستہ انداز میں مقابلہ کیا اسی طرح فرقِ ضالہ باطلہ کا بھی علمی انداز میں خوب تعاقب کیا۔ جس میں رد قادیانیت اور جدیدیت کے نام پر مختلف فرقوں کی مخالفت پیش پیش ہے۔ ہندوستان جیسے متعصب ہندو ملک میں رہتے ہوئے آپ نے مسلمانوں کے تشخص کو ختم ہونے سے بچائے رکھا۔ آپ نے ہندوستان میں "مسلم پرسنل لاء بورڈ" کے صدر کی حیثیت سے مسلمانوں کے حقوق کے حصول کیلئے تاریخی جدو جہد فرمائی۔ اور پھر ان حقوق کی نگہبانی بھی کی۔ یہ ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ ع

وہ ہند میں سرمایہ ملت کا نگہبان

اور ہمیشہ متعصب ہندو حکومت کے امتیازی قوانین کی مخالفت امام احمد بن حنبلؒ کی طرح کرتے رہے۔ جسکی پاداش میں آپکو اواخر عمر تک طرح طرح کی صعوبتوں اور مشکلات سے گزرنا پڑا۔ لیکن آپ نے کلمہ حق ظالم' جابر 'اور کافر حکمرانوں کے سامنے ببانگ دہل کہنا مرتے دم تک نہیں چھوڑا۔

ے

عمریست که افسانه منصور کهن شد

ما از سرنو زنده کنیم دارورسن را

آپ کوئی روائتی مولانا نہ تھے بلکہ آپ کی شخصیت ہشت پہلو تھی۔ حلقہ صوفیاء اور مسند تدریس سے لے کر آکسفورڈ اور کیمرج یونیورسٹی کے ایوانوں تک آپکی آواز کو غور اور توجہ سے سنا گیا۔ اور آپکی عظیم شخصیت اور بے مثال خدمات کا اعتراف مغربی دانشوروں اور اعلیٰ علمی اداروں نے بھی کیا۔ ليس من الله بمستنكرٍ ان يجمع العالم في واحد

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی طرح آپکی شخصیت نے شریعت و طریقت اور دین و دنیا کے تمام شعبوں میں عالم انسانیت کی صحیح راہنمائی فرمائی۔ آپکے خامہ ء معجز رقم اور اعتدال پسند قلم کا اعتراف پیران کلیسا و حرم دونوں نے کیا۔ آپ نے امت مرحومہ کو بانگِ درا کی مانند نواھائے

پریشاں سے جھنجھوڑا۔ اس لئے کہ آپ بھی چند گنے چنے محرم رازوں میں سے تھے۔ آج آپکی یاد میں دجلہ، فرات، نیل، آمو، راوی، لاسین، گنگا، جمنا سب غم کے آنسو بہا رہے ہیں۔

آپ عظیم مبلغ، پر درد داعی، بےنظیر عالم، بے مثل خطیب، لاثانی ادیب، بلند نگاہ سیاستدان، عالی فکر لیڈر، کہنہ مشق مدرس، نبض شناس و مدبر مہتمم اور حکیم فرزانہ تھے۔ عالم اسلام کے اتحاد و یکجہتی، غلبہ اور نشاۃ ثانیہ کبھی سوز و ساز رومی اور کبھی پیچ و تاب رازی کی طرح اس ندوی فاضل کے قلب و جگر کو ہمیشہ پریشاں رکھتے۔ اسی باعث آپ نیل کے ساحل سے لیکر تا خاکِ کاشغر بلکہ اس سے بھی آگے دن رات خون جگر کو جلا کر کام کرتے رہے۔ ہندوستان کیساتھ پاکستان اور افغانستان اور وسط ایشیاء کے نو مسلم ممالک کی فکر بھی ہر وقت آپکو دامنگیر رہتی۔

آپکو زمانے کے نئے فتنوں اور خصوصاً مغرب کی ابھرتی اور چنگھاڑتی ہوئی ثقافتی یلغار کی بے حد فکر تھی۔ اس بے قابو اور خطرناک سیلابِ بلا کے سامنے آپ نے رابطہ عالمی ادب اسلامی کی تنظیم کے ذریعے ایک کامیاب بند باندھا۔ اور خود بھی ایک عظیم لافانی اسلامی ادبی لٹریچر لکھا اور تنظیم کے پلیٹ فارم سے باقاعدہ اسکے مقابلے کا اعلان کیا۔ دو سال قبل جب آپ لاہور تشریف لائے تھے تو آپ نے ہر جگہ اور ہر علمی مجلس مین اس فتنہ سے مسلمان اہل قلم اور ارباب فکر و نظر کو آگاہ کیا۔

اسی طرح آپ نے بہت ہی اہم اور توجہ طلب دعوت و تبلیغ اور اصلاح و ارشاد کا کام بھی شاندار طریقے سے سرانجام دیا۔ اکابرین تبلیغی جماعت حضرت مولانا محمد الیاس رحمہ اللہ علیہ اور حضرت محمد مولانا زکریا رحمہ اللہ علیہ کیساتھ بھی کافی عرصہ تک شانہ بشانہ کام کیا۔ پھر انکی جدائی کے بعد تو آپ نے ہی ہندوستان میں اسی اہم کام کا بیڑا اٹھایا۔ اور باوجود ضعف و نقاہت کے آخری دم تک اس حساس دعوتی کام کیساتھ منسلک رہے۔ حضرت کی وفات سے جہاں زندگی کے سارے شعبے بے سہارا ہوئے ہیں وہیں پر دعوتی و تبلیغی شعبہ بھی یتیم ہو گیا ہے۔ اس شعبہ میں حضرت نے اتنا زیادہ کام کیا ہے کہ جس پر کئی جلدوں میں ضخیم کتابیں لکھیں جا سکتی ہیں۔

مولانا سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ نے "حکیم مسیح الملک" کے متعلق تعزیتی شذرہ میں جو

کچھ انکے متعلق لکھا تھا حقیقت میں وہ الفاظ آج علی میاںؒ کی وفات پر صادق آتے ہیں :-

"حکیم صاحب کی وفات، خاندان کا ماتم نہیں، دلّی کا ماتم نہیں، قوم کا ماتم ہے، فضل و کمال کا ماتم ہے، اخلاق و شرافت کا ماتم ہے، سنجیدگی کا ماتم ہے، عقل و ذہانت کا ماتم ہے، فکر و اصابت کا ماتم ہے، آزادی و حریت کا ماتم ہے، اخلاق و ایثار کا ماتم ہے، ہندوستان اور مسلمانانِ ہند کا طالع و بخت کا ماتم ہے۔ ع مرثیہ ہے ایک کا اور نوحہ ساری قوم کا "

حضرت علی میاںؒ کی خدمت میں راقم کو یکم جنوری ہفتہ کے روز ایک خط پوسٹ کرنا تھا، (الحق کے اکیسویں صدی کے خصوصی نمبر کے سلسلے میں) جس کا مسودہ بندہ نے پہلے ہی تیار کر رکھا تھا لیکن دست بید اد اجل کی ستم ظریفی دیکھئے کہ اسکا موقع ہی سلب کر دیا۔ انکی اچانک وفات سے دل و دماغ سے گویا شور قیامت اٹھا ہے اس نے قویٰ بالکل مفلوج کر دیئے۔ بارہا جتن کے بعد بھی اداس طبیعت حضرت علی میاںؒ کی تعزیت پر قلم اٹھا نہ سکی۔

خیال وصل سے فرصت مرے جنوں کو ملے
دل و دماغ کو آمادہ فراق کروں

اور اسی تردد میں رہا کہ اپنے زندہ جاوید آئیڈیل ہستی پر کس طرح ماتم کروں؟ اور پھر اس تصور سے ہی قلم اور دل کانپ اٹھتا ہے کہ کوہ ہمالیہ سے بڑی ہستی پر ایک مورِ ناتواں کیا لکھے؟ چاہے تو تھا کہ حضرت کی وفات پر ایک خصوصی عظیم اور ضخیم نمبر شائع کرتا لیکن اچانک سفر پر روانگی کے باعث فی الحال یہ ہمت نہ کر سکا۔ لیکن یہ ہمارے ذمہ ایک قرض ہے اور ویسے بھی حضرت مولانا عبدالحقؒ، اکوڑہ خٹک دارالعلوم حقانیہ، حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ، ماہنامہ الحق اور راقم السطور کے ساتھ حضرت کا جو تعلق خاطر رہا وہ بھی متقاضی ہے۔ بہر حال حضرت کی جدائی کا ماتم تو کئی صدیوں تک زمانہ کرتا رہے گا۔ ع جانے والے تجھے روئے گا زمانہ برسوں

لوح و قلم اور علمی دنیا پر انکے ان گنت احسانات ہیں۔ اور انکا لافانی عظیم لٹریچر صبح قیامت تک روشنی کا مینار بن کر چمکتا رہے گا۔ ع ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سندی و استاذی کی رحلت سے ندوۃ

العلماء، ہندوستان بلکہ پورا عالم اسلام یتیم ہو گیا ہے۔ اور ہندوستان میں مسلمانوں کی ایک ہزار سالہ علمی، سیاسی، روحانی عظمتوں کے جو بچے کھچے سلسلے تھے آپکی وفات سے انکا خاتمہ ہو گیا۔ قصرِ ملت میں آپکی جدائی سے ایسی دراڑیں پڑ گئیں ہیں جسکا پر ہونا صبح قیامت تک بظاہر محال نظر آتا ہے۔

وماکانِ قیس هلکه هلك واحد ولا کنه بنیان قوم تهدما

دعوت و عظیمت کا پیکر اور "کاروانِ زندگی" کا مسافر بلآخر "کاروان آخرت" کا ہمرکاب بن گیا۔ بزم علم وادب کی وہ آخری شمع بھی بجھ گئی جس کی لو کے طفیل امت مسلمہ کو روشنی کی کرنیں مل رہی تھیں۔ ؎ اس شہر بے چراغ میں تنہا دیا ہوں میں

کتنی اندھیری رات ہے اور بجھ رہا ہوں میں

آپکے بعد بھی مسند علم تو قائم رہے گی لیکن سونی، بے رونق، بے مزہ اور بے کیف و رنگ۔

ع اب انہیں ڈھونڈھ چراغِ رخِ زیبا لے کر

اسی طرح حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ نے مولانا شبلی نعمانیؒ کی وفات پر تحریر فرمایا تھا کہ ہندوستان کا آخری لائق فرزند بھی ہمیں داغِ مفارقت دے گیا۔ لیکن خاکسار کی نظر میں ہندوستان کے آخری لائق فائق فرزند حضرت علی میاںؒ قدس سرہ، تھے۔ یقیناً اسکے بعد بھی ہندوستان کی مردم خیز سرزمین شخصیات اور عظیم ہستیاں پیدا کرے گی۔ لیکن وہ کوکھ ہمیشہ کے لئے بانجھ ہو گئی۔ جو حضرت مولانا علی میاںؒ جیسی شخصیات جنا کرتی تھی۔ ؎

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں

تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ کے بعد آپ ہی میرے موجودہ وقت میں آئیڈیل تھے۔ آپ کی پہلی زیارت دارالعلوم دیوبند کے صد سالہ اجلاس کے موقع پر راقم (جب اسکی عمر صرف ساتھ برس تھی) کو نصیب ہوئی۔ جبکہ مجھے اپنے والد ماجد مدظلہ اور جدّ بزرگوار اقدس سرہ کی رفاقت میں دیوبند جانے کی سعادت حاصل ہوئی۔

اس وقت سے میں ترا پرستار حسن ہوں دل کو مرے شعور محبت بھی جب نہ تھا

اسکے بعد آپ دار العلوم حقانیہ ۱۹ جولائی ۱۹۷۸ء میں تشریف لائے۔ اور تیسری بھرپور مگر آخری ملاقات دو سال قبل آپکی لاہور آمد کے موقع پر ہوئی۔ اور کامل ایک ہفتہ آپکے قدموں میں رہنے کا موقع غنیمت میسر ہوا۔ جسکی تفصیلی روداد ماہنامہ "الحق" اور روزنامہ "جنگ" میں شائع ہو چکی ہے۔ اور آپ ہی میرے افکار و نظریات کے امام تھے۔ آج کے بعد تعزیتی کلمات کیلئے قلم اٹھے گا لیکن اسکے لہجے میں وہ سوز اور وہ گداز نہانی نہ ہوگا۔ آج تو خود قلم یتیم اور ادب لاوارث ہو گیا۔ مسند علم ویراں ہو گئی۔ حروف و معنی کے فانوس بجھ گئے۔ تحریر کا بانکپن رخصت ہوا۔ تقریر کا زمزمہ جاتا رہا۔ منبر و محراب کی رونق ماند پڑ گئی۔ افکار کی تازگی اور نظریات کی طراوت عنقا ہوئی۔ لفظ امیر اور قائد کا حقیقی مصداق لغت کی ڈکشنری سے محو ہوا۔ علامہ شبلیؒ کے ندوۃ العلماء کی آبرو رخصت ہوئی۔ اور ندوی قبیلہ کا طرۂ امتیاز نہ رہا۔ منزلوں کے چہرے اتر گئے۔ اور جادۂ ہائے منزل گویا گرد پوش ہوئے بلکہ یوں کہئے کہ "کاروان زندگی" ہی تھم گیا۔

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ کی رحلت پر ایک شاعر نے جو رقت انگیز مرثیہ لکھا تھا اس کے چند اشعار اپنی محبوب ہستی کی یاد میں آخری بار نذر کر رہا ہوں۔ (سمجھ میں نہیں آتا کہ رشد و ہدایت اور علم فضل کے آفتاب عالم تاب کو کس طرح الوداع کہوں۔ کہ اب تک تو اس وحشت اثر جدائی کا تصور بھی وہم و گماں میں نہیں گزرا تھا۔ فمن شاء بعد ک فلیمت فعلیک کنت احاذر)

اک جنازہ جا رہا ہے دوش عظمت پر سوار — پھول برساتی ہے اس پر رحمت پروردگار
غیرت خورشید عالم ہے کفن ہے تار تار — ابرِ گوہر بار کے اندر ہیں دُرِّ شاہ وار
نوحہ خواں ہیں مدرسے اور خانقاہیں سوگوار — آفتاب علم و تقویٰ چھپ گیا زیر مزار
شمع محفل بجھ گئی باقی ہے پروانوں کی خاک — اب نہ تڑپے گی کبھی محفل میں دیوانوں کی خاک

یَا اَیَّتُھَا النَّفسُ المُطمَئِنَّۃُ ارجِعِی اِلیٰ رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَرضِیَّۃً
فَادخُلِی فِی عِبَادِی وادخُلِی فِی جَنَّتِی۔

☆☆☆☆☆